© rasailojaraid.com

جناب ایس اے رحمٰن سابق چیف جسٹس پاکستان

آزادی کے تقاضے اور ہم

زمانہ نے تاریخ کا ورق الٹا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو صبح آزادی طلوع ہوئی۔ چاند ستارے والا جھنڈا پہلی بار اس خطۂ ارض پر لہرایا۔ دلوں میں ولولے ابھرے۔ ذہنوں نے جلا پائی۔ آنکھوں میں خوشی اور تشکر کے دیے جھلملائے۔ ریڈیائی لہروں پر ایک نئے نغمہ کے بول گونج رہے تھے

"پاکستان بنانے والے! پاکستان مبارک ہو"

اس نشاط انگیز فضا کے ایک افق پر زخمی مگر بشاش چہروں کا سیلاب امڈا۔ یہ ان لٹے پٹے مسافرانِ حرم کے چہرے تھے جو دور دراز کی منزل، آبلہ پائی کے سہارے طے کر کے آئے تھے۔ جگر لخت لخت ساتھ لیے جب ان نو واردوں نے اس سرزمین پر قدم رکھا، جسے خدا کے مقدس نام پر حاصل کیا گیا تھا تو گرم جوش انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کی دل و جان سے پذیرائی کی۔ یوں امیدوں اور امنگوں کے سائے میں ایک ریاست کی بنیاد رکھی گئی جس کے متعلق دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ محض ایک ملکی قومیت نہیں بلکہ اقدارِ اسلامی کی تجربہ گاہ اور ایک مثالی نظریاتی مملکت کا پیش خیمہ ہو گی تاکہ دنیا جان لے کہ اسلامی تصورِ حیات زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز، ایک زندہ اور پائندہ حقیقت ہے، جس سے نسلِ انسانی کی فلاح وابستہ ہے۔ اس برصغیر میں تحریکِ پاکستان دو قومی نظریہ کی بنیاد پر اٹھائی گئی تھی۔ ہمارے قائد نے علیحدگی پسندی کا جواز دنیا کے سامنے یہی پیش کیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں جو اپنی جداگانہ تاریخ، ایک مخصوص ثقافت اور ایک منفرد تصورِ زندگی رکھتی ہے۔ اس قوم کے لیے ایک خطۂ آزاد کا مطالبہ اس لیے کیا گیا تھا تاکہ اس کے افراد اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں بلا تعرض اسلامی سانچے میں ڈھال سکیں۔ اس بلند نصب العین کی لگن نے ہندوستان کے ان صوبوں کے مسلمانوں کو بھی جہاں وہ اقلیت میں تھے، اس تحریک کا علمبردار بنا دیا۔ ورنہ ان پر روشن تھا کہ ان کی اپنی جنم بھومی ان کے خوابوں کی مملکت میں شامل نہ ہو سکے گی۔ اسی آدرش کی سنہری زنجیر نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے خطوں کو، ہزار میل سے زیادہ کی درمیانی مسافت کے باوصف ایک دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے وابستہ کر دیا۔

اس نظریاتی اصل کا اقتضا یہ تھا کہ ہم اس نئے ملک کے اساسی آئین کی تشکیل اسلامی تصورات کی روشنی میں کریں۔ ملکی قوانین اور احکام قرآن و سنّت میں توافق پیدا کریں اور ایک ایسے معاشرہ کا ڈول ڈالیں جس کی روح میں سماجی عدل و انصاف کی اسلامی اقدار سموئی گئی ہوں۔ آزادی کے نئے ماحول میں زندگی کا گُر ہمیں قائداعظم محمد علی جناح نے سمجھا دیا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ ایمان، اتحاد اور تنظیم کی تکون کے اندر رہو گے تو کامیابی تمھارے قدم چومے گی۔ ہماری سیاسی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ قائداعظم جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پھر زیادہ وقت نہ گزرا کہ ملک میں ابتدائے شوق کے ولولے قلب و نظر کے فساد کی نذر ہو گئے۔ غیر مسلموں کی متروکہ جائداد کا زہر جسدِ معاشرہ میں پھیلنا شروع ہوا۔ ایمان کی بظاہر سنگلاخ چٹانیں اس زہرآب میں گداز ہوتی دیکھی گئیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ سیاسی لیڈروں نے، جنھیں اسلامی اقدار کے مقابلے میں اپنی کرسیوں کا استحکام زیادہ عزیز تھا، ملک کے پہلے انتخابات میں ووٹ حاصل کرنے کی خاطر، دھن، دھونس، دھاندلی کو روا رکھا۔ کہا یہ گیا کہ وطن عزیز کی سالمیت کا تقاضا ہے کہ برسراقتدار پارٹی کی کامیابی یقینی ہو جائے۔ یوں سیاسی اغراض کے حصول کے لیے غیر اخلاقی ذرائع کے استعمال کی روایت قائم ہو گئی اور یہ ابدی حقیقت آنکھوں سے اوجھل ہو گئی کہ جَو بونے والے گندم کی فصل کبھی نہیں کاٹ سکتے۔

بدعنوانیوں کا سلسلہ ایک دفعہ چل نکلا تو تھمنے میں نہ آیا۔ سیاست میں نفسی نفسی کا دور دورہ ہوا۔ سیاسی گرگٹوں نے اپنی وفاداریاں شب و روز اس سرعت سے بدلنا شروع کیں کہ مجالس قانون ساز پر مداریوں کے ٹولوں کا شبہ ہونے لگا۔ وزارتوں اور پارلیمانی عہدوں کی دوڑ میں پتلونیں لنگوٹیاں ہو کر رہ گئیں لیکن طالبانِ اعزاز کی فوج ظفر موج روز بروز ترقی کرتی گئی، حتیٰ کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا کہ جاہ و منصب کے پجاریوں کے علاوہ کوئی معمولی رکن بھی ان اداروں میں باقی رہ گیا یا نہیں۔ جماعتی ریشہ دوانیوں اور محلاتی سازشوں نے اہل سیاست کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی۔ آئین سازی کی مہم شخصیتوں اور گروہوں کی آویزش کی بھینٹ چڑھ گئی اور نتیجہ کے طور پر ملک آئینی تعطل سے دوچار ہو گیا۔ بارے ۱۹۵۵ء میں وحدتِ مغربی پاکستان کا قانون پاس ہوا اور خدا خدا کر کے ۱۹۵۶ء میں پارلیمانی دستور اساسی مرتب ہوا۔ اس دستور کے ماتحت انتخابات نہ ہونے پائے تھے کہ ۱۹۵۸ء میں ملک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مارشل لا کے زیر نگین آگیا۔ ۱۹۶۲ء کے آئین کے نفاذ کے ساتھ ہی عسکری راج ختم ہوا اور ملک نے صدارتی نظام کا تجربہ ایک مخصوص آئینی نظریہ کے ماتحت کیا۔ اس تجربے کی ناکامی بالآخر آشکارا ہو گئی اور ۱۹۶۹ء کی عوامی تحریک کے سیلاب نے حزب اقتدار کو اپنی گدیاں خالی کرنے پر مجبور کر دیا لیکن اس کو کیا کہیے کہ اس نازک مرحلہ پر بعض سیاسی لیڈر محض پیرؤں کے پیرو نظر آئے اور اپنے تجربہ اور فراست سے کام لینے کی بجائے ندائے انبوہ سے رہنمائی کے طالب ہوئے۔ تخریبی عناصر نے ملک گیر فسادات کو ہوا دی اور ہمارے فوجی بھائیوں کو ملک کو مزید انتشار سے بچانے کی خاطر زمام کار اپنے ہاتھوں میں لینا پڑی۔ یہ ہے ہماری آئینی سرگرمیوں کی دلخراش داستان۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہم دشت آئین سازی میں سرگشتہ رہ کر آخر کار حیرت کی اسی منزل پر آ کھڑے ہوئے جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

اب صورت یہ ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں سے بھانت بھانت کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۵۶ء کا دستور اسلامی آئین کی تعریف میں آتا ہے اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اس کی بازاختیاری کے بعد اس میں مناسب ترمیمات کی جا سکتی ہیں۔ ایک اور طبقہ جس کے نہاں خانۂ دماغ میں لادینی ریاست کا تصور مستور ہے لیکن جسے وہ کھل کر سامنے لانے سے گریز کرتا ہے، اشتراکی نظام کے گن گا رہا ہے اور اسے ملک کے لیے واحد ذریعۂ نجات سمجھتا ہے۔ اس طبقہ کا بظاہر ہمنوا ایک اور گروہ ہے جو دیانت داری سے یہ فرض کیے بیٹھا ہے کہ سماجی عدل کا اقتصادی منصوبہ اشتراکیت سے مستعار لے کر اسے اسلامی تصور زندگی سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ کچھ اور لوگ جو ہنوز روز اول کے قائل معلوم ہوتے ہیں، کہہ رہے ہیں کہ بالغ رائے دہی اور پارلیمانی طرز حکومت کے اصول تسلیم کر کے ملک میں انتخابات کرائے جائیں اور پھر آئین سازی کا کام عوام کے منتخب نمائندوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ ان حضرات کو اس بات کا احساس نہیں کہ انتخابات کرانے کے لیے بھی ایک آئینی نظام کی بنیاد ضروری ہے۔ اگر دستور سازی کا کام پھر کوشش کی کٹھالی میں ڈال دیا گیا تو گزشتہ بائیس برس کی ناقابل رشک تاریخ کا اعادہ ممکنات میں سے ہو جاتا ہے۔

بعض سیاسی اکابر اس رائے پر اصرار کر رہے ہیں کہ پارلیمانی نمائندگی آبادی کی بنا پر ہو۔ وحدت مغربی پاکستان کو توڑ دیا جائے اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود اختیاری سے نوازا جائے۔ چند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علمائے کرام ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دستوروں کو غیر اسلامی بتا رہے ہیں اور ایک نئے اسلامی آئین کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آئینی مسئلہ کے متعلق اکثر اصحاب کے ذہن صاف نہیں ہیں۔ میری ناچیز رائے میں ہر وہ دستور اسلامی کہلا سکتا ہے جس کی اساس حاکمیت توحیدِ الٰہی، مساوات انسانی، نمائندگی جمہور اور باہمی مشاورت کے بنیادی اصولوں پر رکھی گئی ہو۔ یہ اصول نہ پارلیمانی نظام کے منافی ہیں نہ صدارتی نظام کے۔ دستور اساسی دراصل ایسے قواعد کے مجموعہ کا نام ہے جو ریاست کے مختلف اداروں کے اختیارات اور طریق کار متعین کرتا ہے اور مسلّمہ سماجی اقدار کی حفاظت کا ضامن ہوتا ہے۔ اس تشریح کی روشنی میں دیکھا جائے تو نہ ۱۹۵۶ء کا آئین غیر اسلامی تھا اور نہ ۱۹۶۲ء کا۔ دونوں کے مطابق ریاست اسلامی اقدار حیات کے فروغ پر مکلف ہوگی اور ہر وہ ملکی قانون باطل ٹھہرے گا جو قرآن و سنت سے متصادم ہوگا۔ عوامی نمائندگی اور شوریٰ کے اصول دونوں میں مشترک تھے گو ان کی پیش رفت کے لیے مختلف طریق کار تجویز کیے گئے تھے۔ ایک اسلامی معاشرہ سے یہ اختیار سلب نہیں کیا جا سکتا کہ زمان و مکان کی مقتضیات، اپنے مخصوص حالات اور اپنی احتیاجات کے مطابق اساسی اصولوں کی روشنی میں ایسا نظام حکومت وضع کرے جو اس کی رائے میں اس کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب سے زیادہ موثر ہو۔ اس میں صدارتی، پارلیمانی یا کسی اور نظام کی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ لہٰذا ۱۹۶۲ء کے دستور پر بھی اس کی نوعیت کے لحاظ سے کوئی ٹھوس اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں عملی پہلو سے محاکمہ کیا جا سکتا ہے کہ کون سی طرز حکومت ہمارے مفادِ ملّی کے حصول میں ہماری معاون ہو سکتی ہے۔ انتخاب آئین کے سلسلے میں شہاب الدین کمیشن رپورٹ کی سفارشات سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ کلیہ یہ ہے کہ کسی آئین کی عملی کامیابی اس کے نافذ کرنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کی نیک نیتی پر منحصر ہوتی ہے۔

۱۹۶۲ء کے آئین سے بے اطمینانی کی اصل وجہ وہ بدعنوانیاں ہیں جو اس دستور کے ماتحت انتخابات میں راہ پا گئیں۔ سرکاری سطح پر رسوخ اور دباؤ یا مراعات و ترغیبات اور ووٹروں کی سنہری روپہلی مصلحتوں نے جو کردار سرکاری پارٹی کی کامیابی میں ادا کیا، وہ کسی ہوش مند سے مخفی نہیں۔ اگر انتخابات بغیر کسی خارجی اثر یا دباؤ کے ہوتے تو یہی دستور عوام کے حقیقی نمائندوں کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقامِ اقتدار پر فائز کر سکتا تھا۔ ہوا یہ کہ نوکر شاہی کو مطلب برآری کے لیے آلۂ کار بنایا گیا اور اس طرح سے سرکاری افسروں کے اخلاقی شعور کو کچل دیا گیا۔ اب وہ الاماشاء اللہ رضائے ملائے اعلیٰ کو بھانپ کر ہی کوئی اقدام کرتے تھے۔ ان حالات میں تمام فضا مسموم ہو گئی۔ بدعنوانی جو اونچی سطح سے شروع ہوئی تھی قلۂ کوہ کی برف کی طرح آہستہ آہستہ پھسل کر زیریں طبقوں میں سرایت کر گئی۔ دفتروں میں کھلے بندوں رشوت متاعِ دست زد ہو گئی۔ دفتر شاہی جو پہلے ہی سرخ فیتے کے جال میں جکڑی ہوئی تھی، عوام سے نفسیاتی طور پر اور بھی دور ہوتی گئی۔ اور بالآخر انتظامیہ کا رشتہ عوامی بنیادوں سے سراسر کٹ گیا۔

ادھر سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لیے جو منصوبے بنے، ان سے صنعتی اکابر اور اہلِ تجارت نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اجارہ داری، ذخیرہ اندوزی، منافع بازی، چور بازاری اور محصول چوری نے ملکی معیشت میں بحران کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ عوام میں یہ احساس پختہ ہو گیا کہ نہ حکومت کے قیام میں ان کا عمل دخل ہے اور نہ اقتصادی حالات ان کے لیے ساز گار ہیں۔ دولت چند خاندانوں میں مرکوز ہو کے رہ گئی۔ اور عوام کو دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا بھی مناسب داموں دستیاب نہ ہوا۔ حکومت کے خلاف غیظ و غضب کا لاوا زیرِ زمین پکتا رہا اور آخر کار آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا۔ اس موقع سے یار لوگوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ سرمایہ اور محنت کے تعلقات کو سلجھانے کی بجائے "گھیراؤ"، آتش زنی اور دیگر جبری کارروائیوں سے اور پیچیدہ بنا دیا گیا۔ علاقائی عصبیتیں ابھریں۔ لسانی اختلافات کے جھنڈے لہرائے گئے اور اس افراتفری میں ملکی سالمیت کا خیال زیبِ طاقِ نسیاں ہو گیا۔

وحدتِ مغربی پاکستان میں یقیناً اونچی سطح پر ارتکازِ اختیارات سے انتظامی مشکلات پیدا ہوئیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اہلِ سیاست نے اتحاد کے درخت کی آبیاری اور صحیح نشوونما کی تدبیر کرنے کی بجائے مشکلات کا حل اس میں سمجھا ہے کہ شاخوں کو کاٹ کر علیحدہ کر لیا جائے۔ خواہ اس عمل سے درخت کا وجود ہی مخدوش ہو جائے۔ نظامِ وحدت میں بجلی، پانی، گیس اور مواصلات کے منصوبوں کی موجودہ عملی شکل اس قطع و برید سے متعارض ہے۔ اور متبادل نظام مسرفانہ حد تک کثیر مصارف کا باعث ہو گا۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ اس مطالبہ کی تائید مشرقی پاکستان کے ان عناصر سے بھی ہو رہی ہے جو وفاقی نظام میں دونوں موجودہ صوبوں کی مساوات کے مسلمہ اصول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو خیر باد کہنا چاہتے ہیں۔ ان کی تجویز ہے کہ مرکزی پارلیمان میں دونوں صوبوں کی نمائندگی آبادی کی بنیاد پر ہو۔ مرکز کے اختیارات کم سے کم رکھے جائیں اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود اختیاری حاصل ہو۔ یہ بات نظر انداز کر دی گئی ہے کہ آبادی کی بنیاد پر عوامی نمائندگی وحدانی حکومت کا تقاضا کرتی ہے جو ملک کے دونوں بازوؤں کی درمیانی مسافت کے پیش نظر ہماری مشکلات کا معقول حل نہ پیش کر سکے گی۔ اور اگر حکومت وفاقی ہو تو اس صورت میں دو ایوانوں کے قیام سے مفر نہ ہو گا، جن میں سے ایک کی اساس آبادی کا تناسب ہو اور دوسرا وفاقی اکائیوں کی یکساں نیابت کے اصول پر مبنی ہو۔ نیز اگر وحدت مغربی پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ضروری ہے تو مغربی بازو میں شاید ایک ذیلی وفاق لازم آئے گا کیونکہ بصورت دیگر ایوان بالا میں مشرقی پاکستان کے ایک ووٹ کے مقابلے میں مغربی صوبوں کے متعدد ووٹ ہوں گے۔ علاوہ ازیں یہ ایک بھاری بھرکم گراں مصارف نظام ہو گا۔ پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ دونوں صوبوں کی آبادی کا تناسب کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ آبادی ہر خطے میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ایسی ناستحکم بنیاد کی بجائے مشرق و مغرب کی مساوات کا اصول اپنا لینے ہی سے غیر ضروری پیچیدگیوں سے بچاؤ کی صورت نکل سکتی ہے۔ اس مساوات نے مشرقی پاکستان کے زعما کے اصرار پر ہی ۱۹۵۶ء کے دستور میں جگہ پائی تھی۔ حالات کی منطق ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم علاقائی یا صوبائی سطح کی بجائے آئینی مسئلہ کا حل پاکستانی سطح پر تلاش کریں اور ہم مرکز کو اتنا کمزور نہ کر دیں کہ اس کی بین الاقوامی ساکھ مجروح ہو جائے۔ داخلی مشکلات کے علاوہ خارجی عوامل بھی اس نوع کے برائے نام مرکز کو ناکارہ بنا سکتے ہیں۔ ان اہم مسائل کا صحیح فیصلہ آزادانہ انتخابات کے بعد عوامی نمائندے ہی کرنے کے مجاز ہوں گے۔ یہ انتخابات فی الحال ۱۹۵۶ء کے دستور میں مناسب ترمیم کر کے کرائے جا سکتے ہیں۔ محض سیاسی دکانیں چمکانے والے لیڈروں کی صوابدید پر یہ معاملات نہیں چھوڑے جا سکتے۔

یہ تو رہا آئین کا مسئلہ۔ اب قوانین کے قضیہ کی طرف آیئے۔ آغاز پاکستان ہی سے یہ مطالبہ عوامی تحریروں اور تقریروں سے دہرایا جا رہا ہے کہ رائج الوقت قوانین کو قرآن و سنت سے ہم آہنگ کیا جائے۔ یہ مطالبہ حکومتی سطح پر تسلیم شدہ ہے۔ اور ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دستور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں اس کی ضمانت دیتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ہم اس بارے میں فکری انتشار کا شکار ہیں۔ عوامی ذہن میں یہ خیال جاگزیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر بعض جرائم کے لیے قرآنی حدود نافذ کر دی جائیں تو یہ کافی ہوگا۔ لیکن اکثر اہل فکر و نظر اس خیال کے حامی ہیں کہ ان حدود کا نفاذ ایک صحیح قسم کے اسلامی معاشرہ کے قیام کے بعد ہی ممکن ہوگا۔ کیونکہ اسی نوع کے معاشرہ میں ارتکاب جرم کی ترغیبات کم سے کم رہ جائیں گی۔ تعزیراتی قوانین کے علاوہ ملکی قانون کا بہت بڑا حصہ غالباً مباح کی شرعی اصطلاح کے زیر سایہ آجائے گا۔ لیکن قانونی محیط کے بعض قطعے ایسے ہیں جہاں قدیم و جدید کی آویزش کا امکان ہے۔ مثال کے طور پر تجارتی اور بنکاری سود اور تامین (Insurance) کے مسائل پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ذاتی املاک و جائداد، ذرائع پیداوار کی ملکیت، ملکی آمدنی کی منصفانہ تقسیم کے مسئلوں پر بھی آج کل کئی حضرات طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ اس بحث و تمحیص کی نسبت اہل علم کا یہ فریضہ ہے کہ ملکی قانون کا جائزہ لے کر مجلس قانون ساز کی رہنمائی کریں کہ اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے کس حد تک ردّ و بدل کی ضرورت ہے۔ یہ کام اہم بھی ہے اور نازک بھی۔ حکومت نے اس تحقیق کے لیے کئی اداروں کی تاسیس کی لیکن ہمارے قومی کردار کا یہ المیہ ہے کہ ان علمی کوششوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ اور مداخلت فی الدین کے نعرے بلند ہونے شروع ہوئے۔ خردہ گیری اور مخاصمانہ تنقید کے دریا تو فیاضی سے بہائے گئے لیکن تعمیری اور ٹھوس کام کی طرف توجہ بہت کم ہوئی۔ روایت پرست علما کا طبقہ بزرگانِ سلف کی تصنیفات میں ایک شوشہ بھر تبدیلی کا بھی قائل نہیں معلوم ہوتا۔ اگرچہ وہ نظری طور پر اجتہاد کے جواز و ضرورت سے انکار بھی نہیں کرتا۔ اس طبقہ کے نزدیک فقہ میں اب کسی مزید تفکر و تدبر کی گنجائش نہیں۔ دوسری طرف ایک اور طبقہ ہے جو اس جمود پرستی کے ردِ عمل کے طور پر دین بیزاری کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ اور اشتمالیت و اشتراکیت کے سبز باغوں میں فلاحی بہاروں کی بو سونگھ رہا ہے۔ خاموش تماشائیوں کی اعتدال پسند جماعت ان دو متحارب گروہوں کے درمیان سرگشتہ و حیران ہے کہ رُخ کس سمت کرے۔ اس درمیانی گروہ میں کچھ خود اعتمادی کی کمی ہے اور اس لیے محاذ آرائی سے گریز کرتا ہے۔ حق یہ ہے کہ ائمہ کرام نے اپنی آراء کے متعلق کسی زمانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بھی قطعیت کا دعویٰ نہیں کیا اور اجتہاد کا دروازہ امت پر ہر وقت کھلا ہے۔ الیوم اکملت لکم دینکم کے ارشاد ربانی کا مفہوم یہ نہیں کہ دین اپنی تمام جزئیات و فروعات کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ایک حجری قالب اختیار کر چکا ہے۔ عُرف جو شرع کا ایک جزو ہے، تغیر پذیر چیز ہے۔ اس کے علاوہ یہ بعید از قیاس ہے کہ ایک اکمل دین میں زمان و مکان کی فطری تبدیلیوں سے موافقت کے لیے لچک موجود نہ ہو۔ کوئی انسانی معاشرہ جامد و ساکن نہیں رہ سکتا۔ تغیر پذیر زندگی کے قافلے کو ابدی بنیادی اصول تو عطا ہوئے ہیں تاکہ انسان گمراہ نہ ہو جائے لیکن ساتھ ہی زمانہ اور موسم حیات کی تبدیلیوں کی مناسبت سے جزئیاتِ زاد راہ کے معاملہ میں اہل قافلہ کو آزادی دی گئی ہے کہ وقتاً فوقتاً اپنی اجتماعیت کے تقاضوں اور ذیلی قوانین میں توافق پیدا کر سکیں۔ میری ناچیز رائے میں قدیم علوم کے ماہرین اور جدید علوم کے فاضلوں کے اشتراکِ عمل اور تعاون سے ہی یہ گتھی سلجھ سکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے علمی ورثہ کا جائزہ لے کر اٹل بنیادی احکام کی روشنی میں نئے معاشرتی اور اقتصادی قضیوں کا حل سوچیں۔ اگر اجتہادی بصیرت کو بروئے کار لا کر معاشی ناہمواریوں اور قانونی اسقام کا علاج نہ کیا گیا تو خطرہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل جو جذبا تی بھی ہے اور عینیت پسند بھی کہیں اشتراکی کوچہ گردوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔

ذاتی ملکیت کا سوال آج کل کا نزاعی مسئلہ بن چکا ہے۔ بعض حلقوں میں یہ کہا جا رہا ہے کہ اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند لگا کر ہم اپنی تمام مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔ سوشلزم کی اصطلاح مختلف ذہنوں کے لیے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ اکثر خوش فہم اور سادہ مسلمان اسے محض فلاحی ریاست کے مترادف سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فلاحی ریاست کا عملی نمونہ سب سے پہلے دنیا کی تاریخ میں اسلامی خلافتِ راشدہ نے پیش کیا تھا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ سوشلزم کے تصورات میں بمرورِ زمانہ ارتقا ہوا ہے۔ ابتدائی صورتیں فلاحی منصوبے سے کچھ زیادہ متاثر نہ تھیں لیکن مارکس اور اینجلز نے سائنٹفک سوشلزم کا نظریہ قائم کر کے اسے ایک فلسفۂ حیات بلکہ ایک عقیدے کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ اور اب ہمیں سوشلزم کی مارکسی تعبیر کو ہی اس کا صحیح نمائندہ سمجھنا چاہیے۔ مارکسی اشتمالیت یا اشتراکیت کا بنیادی نقطہ جدلی مادیت کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظریہ ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اقتصادی عوامل ہی زندگی کے فکری اور عملی نظام کو جنم دیتے ہیں اور روحانی اقدار کا ڈھونگ سرمایہ داری نے اپنی پیدا کردہ طبقاتی کش مکش کی شدت سے بچنے کے لیے رچایا ہے۔ مقصود اس سے پرولتاریہ کو مذہب کی افیون دے کر خواب غفلت میں سلانا ہے۔ سرمایہ داری نظام کے بطن میں ایک تخریبی عنصر مضمر ہے، جو خود اس کے رد عمل کے طور پر ابھرتا ہے۔ قدر زائد کا خالق صرف محنت کش طبقہ ہے۔ اور طبقاتی جنگ آخر اسی طبقہ کی بالادستی و حکومت پر منتج ہوگی۔ لیکن اس تاریخی جبری عمل کو تیز تر کرنے کے لیے اشتراکی کارکنوں کو حکمت عملی یا تشدد سے جیسے بھی بن پڑے سرمایہ دار طبقہ کو ختم کر دینا چاہیے۔ اس طرح سے ایک غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آجائے گا، جس میں تمام ذرائع پیداوار اور املاک ریاست کی ملکیت میں آجائیں گی اور ذاتی ملکیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ذاتی ملکیت ہی تمام خرابیوں اور نزاعوں کی جڑ ہے۔ اور اس کے ازالہ کے بعد انسانی معاشرہ حقیقی فلاح و مسرت سے آشنا ہوگا۔ ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق ریاست کام لے گی اور اس کی احتیاج کے مطابق اس کے کھانے پینے، پہننے، رہنے سہنے کی کفیل ہوگی۔ اس طرح سے استحصال اور منافع کے محرکات اقتصادی نظام سے غائب ہو جائیں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ اشتراکی جنت تاریخ کے جدلی عمل سے خود بخود وجود میں آجائے گی تو اشتراکیوں کی سرگرمیوں کے لیے جن میں تشدد اور جنگ شامل ہیں، کیا جواز رہ جاتا ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ جدلی عمل اشتراکی نظام کے قیام کے بعد کیوں خودکشی کرے گا؟ اگر یہ زندگی کے ارتقا کا ایک کلیہ ہے تو اسے اشتراکیت کی کامیابی کے بعد بھی جاری رہنا چاہیے۔ یہ نظریہ، اشتراکیت کے اندرونی تضادات ہیں اس نظریہ کی عملی تشکیل سب سے پہلے روس میں ہوئی ہے اور یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ برسر اقتدار پارٹی کو وہاں کسی حد تک انفرادی ملکیت کے اصول سے مفاہمت کرنا پڑی ہے اور وہاں بھی اب عاملوں کے معاوضوں میں تفاوت کی وجہ سے طبقات کا نقش ابھر رہا ہے۔

اشتراکی نظام حیات پر سب سے زیادہ وزنی اعتراض یہ ہے کہ اگر تمام ذرائع پیداوار ریاست کی ملکیت ہوں (جس کے معنی عملاً برسر اقتدار پارٹی کی ملکیت ہے)، تو سماج کے قریباً تمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افراد ریاست کے تنخواہ دار یا وظیفہ خوار ہو جائیں گے۔ جمہوریت کے تقاضے ایسے نظام میں پورے نہیں ہو سکتے۔ اشتراکیت ایک جبری عسکریت کا نظام ہے جس میں حریت فکر و آزادیٔ عمل کے فطری داعیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ پارٹی لائن کے خلاف نہ کوئی کچھ سوچ سکتا ہے۔ نہ کہہ سکتا ہے۔ نہ کر سکتا ہے۔ اشتراکیت کے ماتحت زیادہ سے زیادہ مساوات شکم قائم ہو سکتی ہے۔ انسانی فرد کا وقار اور شرف اس سے لگا نہیں کھا سکتا۔ سرمایہ داری کی نفی میں یہ نظام افراط و تفریط کی حدیں پھاند گیا ہے۔ بقول اقبال[7] یہ "لا" کی منزل تک تو پہنچا ہے لیکن ابھی تک "الا" کے مقام سے آشنا نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ الا کے راز کو پالے گا تو اس کی قلب ماہیت ہو جائے گی۔ کیونکہ خدا کی ہستی کا اقرار الوہی ہدایت کے نظام کو بھی واجب التعمیل بنا دیتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں اسلامی تصور زندگی کی عمارت توحید، رسالت اور آخرت کے سہ گانہ عقائد پر کھڑی ہے۔ اس تصور کے مطابق یہ کائنات نہ بے مقصد ہے، نہ محض مادی اقدار کی حامل۔ انسان جسمانی اور روحانی دو عناصر سے مرکب ہے اور اس کے کامل ارتقا میں دونوں عناصر کارفرما رہنے چاہئیں۔ انسان کو موجودات کی تسخیر کی اہلیت عطا کی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی نیابت الٰہی کی عظیم ذمہ داری بھی اس کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ انسان کو ارادہ اور اختیار دیا گیا ہے تاکہ خیر و شر میں تمیز کر سکے۔ اس آزمائشی زندگی میں اس کا عمل اس کی بعد از موت دوامی زندگی پر بھی اثر انداز ہوگا۔ الوہی ہدایت وقتاً فوقتاً انسانوں کے تزکیہ، فطری زندگی کے قیام، اس کے مصالح کے حصول اور اس کے مفادات کے تحفظ کے لیے برگزیدہ و قدسی صفات نفوس کی وساطت سے ہم تک پہنچتی رہی ہے تاکہ فرد انسانی کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کی مکمل نشو و نما ایک صالح اجتماعی نظام میں ہو سکے۔ اس ہدایت کی آخری اور مکمل شکل ہمارے پاس قرآن حکیم کے اوراق میں محفوظ ہے، جس میں اٹل بنیادی اصول زندگی بیان ہوئے ہیں۔ اور جن کے ماتحت ترقی پذیر زندگی کے تمام تقاضے پورے کرنے کے لیے ایک حرکی نظام فکر و عمل کے لیے گنجائش رکھی گئی ہے۔ اسلامی شریعت فرد و اجتماع کے درمیان حقوق و فرائض کا ایک خوشگوار توازن قائم کرتی ہے۔ نہ اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرمایہ داری نظام کے فرد کی بے لگام آزادی کا نظریہ ہے، جو سماج میں فساد کا باعث ہو۔ اور نہ اشتراکی اجتماع کی مطلق فوقیت کا شکنجہ ہے، جو فرد کی شخصیت کو کچل کر رکھ دے۔ اسلامی ریاست کا مقصد اسلامی طرز زندگی کا قیام و بقا ہے۔ اور اسی لیے یہ مکلف ہے کہ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے مفادات کا تحفظ کرے۔ اسلام ایک ایسی اجتماعیت کا طالب ہے، جس میں ہر فرد دوسرے فرد کا مددگار و بہی خواہ ہو اور ہر فرد پورے اجتماع کی فلاح و بہبود کا خواہاں ہو۔ اجتماع افراد کے جذبۂ اخوت و تعاون کا عملی مظہر ہے۔ اور اجتماعی ادارے افراد کے نمائندوں کے باہمی مشورہ ہی سے اپنے وظائف انجام دیتے ہیں۔

اسلامی ریاست کفالت عامہ کی ذمہ دار ہے۔ یعنی دارالاسلام کے اندر بسنے والے ہر انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام اس کا فرض ہے۔ اس کے ماتحت سب افراد کو مساوی مواقع اکتساب مہیا ہوں گے اور اس کے باوجود اگر کچھ لوگ معذور یا محروم ہوں تو ریاست پر ان کی خبر گیری لازم ہوگی تاکہ کوئی باشندہ بھوکا، پیاسا، ننگا، بے ٹھکانہ اور مرض کی حالت میں بے علاج نہ رہے۔ اس ارضی امتحان گاہ میں فرد، ریاست اور اجتماع تینوں کے اعمال و وظائف اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ انھیں اپنی اپنی حدود میں مالکانہ حقوق حاصل ہوں تاکہ وہ اپنی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ بے شک آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے لیکن اللہ ہی نے اکثر چیزوں پر انسانوں کو حقوق بخشے ہیں۔ تاہم یہ مطلق حقوق نہیں ہیں۔ یہ دراصل چند پابندیوں کے ساتھ بقدر ضرورت انتفاع و تصرف کے حقوق ہیں۔ انسان کا جسم و جان، اس کا مال و منال، زمین و مافیہا سب املاک اللہ کی طرف سے اس کے ہاتھوں میں امانت ہیں۔ ان کے حصول پر یہ پابندی ہے کہ حلال طریقوں سے ان کا اکتساب ہو۔ اور ان کے تصرف کی یہ شرط ہے کہ انھیں حلال مقاصد کی خاطر استعمال کیا جائے۔ قرآن حکیم میں بالصراحت کہا گیا ہے کہ تمھارے مال و دولت میں محتاج اور محروم کا ایک مخصوص حق ہے۔ اور فرد کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زائد ہو، اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ فرد پر لازم ہے کہ جسم و جان، املاک و اموال سے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے جہاد کرے۔ آیۂ شریفہ "وجاھدوا باموالکم و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انفسکم فی سبیل اللہ اس پر دال ہے۔ اس ارشادِ ربانی کے علاوہ ہمیں حدیث نبوی میں بھی اس قسم کے اشارات ملتے ہیں۔ رسول کریمؐ نے ایک مرتبہ فرمایا "نعم العون علی تقوی اللہ المال یعنی اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے میں مال بڑا اچھا مددگار ہے۔ ایک اور حدیث کے مطابق تمام مخلوق اللہ کی عیال ہے اور خدا اس کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے جو اس کی عیال کے لیے سب سے زیادہ مفید ہو۔

لیکن اگر سرے سے انفرادی حقوق کو ہی سلب کر دیا جائے تو حصول تقویٰ کا میدان نہایت تنگ ہو جاتا ہے۔ اور سعی انسانی کے لیے فطری محرکات باقی نہیں رہتے۔ قرآن حکیم کی متعدد آیات سے انفرادی ملکیت کے حق میں استنباط کیا جا سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے" انفقوا من طیّبات ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض"۔ یعنی اپنی پاکیزہ کمائی اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں، خرچ کرو۔ ترکہ جو مرنے والا چھوڑ جائے اس کے لیے "خیر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کئی آیات میں زمین، کھیت، باغ، گھر، زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار، سواری اور باربرداری کے جانوروں، سمندر میں چلنے والے جہازوں، نقد سرمایہ اور دوسری اشیا کی ملکیت انسانوں سے منسوب کی گئی ہے۔ کسی کے مملوکہ مال کو بغیر حق کے لینے سے سرقہ کی حد لگ سکتی ہے، وصیت، وراثت اور بیع و شرا کے قانون بھی انفرادی ملکیت کے جواز پر دال ہیں۔ نبی کریمؐ کے ارشاد کے مطابق ایک مسلمان کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو دوسرے مسلمانوں کے لیے قابل احترام ہے۔ متعدد احادیث کی رو سے مالک اپنے مال کی حفاظت کی خاطر اپنی پوری قوت استعمال کر سکتا ہے۔ تاریخ اسلام میں تعامل بھی اسی اصول کے مطابق رہا ہے۔ یہ امر صاف ہے کہ اسلامی شرع ذاتی ملکیت کے بارے میں ایک معتدل اور میانہ روی کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ بعض عوامی مفاد کی چیزیں انفرادی ملکیت کے حلقہ سے باہر رکھی گئی ہیں۔ مثلاً فضائے بسیط، سمندر، دریا، پہاڑ، جنگلات، غیر مملوکہ چراگاہیں، قدرتی چشمے وغیرہ۔ ان اشیا کی مشترکہ خصوصیات یہ ہیں کہ ان کی پیدائی یا دریافت میں انسانوں کو کوئی خاص زحمت اٹھانی نہیں پڑتی اور نہ ان سے استفادہ کے لیے ان میں محنت سے تغیر و تبدل کی ضرورت ہے۔ ایسی اشیا پر انفرادی قبضہ اور تسلط عوام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے مشکلات کا موجب ہو سکتا ہے۔ کسی زمانہ کے مخصوص سماجی یا اقتصادی حالات میں طریقِ انتفاع کی سہولتوں اور عوامی ضرورتوں اور تند مسابقت کی فساد انگیزی سے بچنے کے پیش نظر اجتماعی ملکیت کا حکم اور اشیا پر بھی لگایا جا سکتا ہے لیکن اس کا فیصلہ اولی الامر اجتماعی مفاد کو ملحوظ رکھ کر کر سکتے ہیں۔ معدنیات، پانی، بجلی، گیس، ڈاک کا اہتمام، مواصلات کا نظام وغیرہ کی مثالیں اس ضمن میں دی جا سکتی ہیں۔ ما بقی املاک اگر انفرادی تصرف میں رہیں تو اقتصادی اور اخلاقی کسی لحاظ سے بھی موردِ اعتراض نہیں، بلکہ یہ فیصلہ فطرتِ انسانی کے داعیوں سے موافقت کا ذریعہ ہوگا۔ تاہم ریاست مانع نہیں کہ کسی نوع کی املاک کو اجتماعی مفاد کی خاطر قومیا لے اور مالکوں کو مناسب معاوضہ دے دے۔

تاہم انسان کی اصل حیثیت اسلامی نظام میں ایک مکلف یعنی ذمہ دار ہستی کی ہے نہ کہ محض حقدار کی۔ اس کو حقوق، فرائض کی انجام دہی کے لیے سونپے گئے ہیں۔ شریعت کے نظام میں ہدایت کے کچھ حصے کو تو قانونی شکل دے کر یقینی بنا لیا گیا ہے۔ لیکن امر و نہی کے باقی رقبہ میں تلقین و ترغیب سے افراد کو رضا کارانہ تعمیل پر آمادہ کرنا کافی سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ انسانوں کے اخلاقی شعور کی پرورش سے جبری حد بندیوں کی بہ نسبت زیادہ مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ تقسیم وراثت، زکات، محصولات وغیرہ کے نظام کا مقصد یہ ہے کہ دولت اغنیا کے ہاتھوں میں جمع ہو کر نہ رہ جائے بلکہ مفادِ عامہ کی خاطر گردش میں رہے اور اس طرح سماج عدل و انصاف کی بنیادوں پر مضبوط ہو جائے۔ ساتھ ہی اخلاقی سطح پر صدقات، زائد از ضرورت مال، فی سبیل اللہ خرچ کرنے، انفاق کے احکام اور اسراف و تبذیر، نفع اندوزی، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، اجارہ داری، تجارت میں تلبیس و فریب کاری، ارتکازِ دولت، مضرت رسانی اور استحصال بے جا کی بندش سے اجتماعی فلاح اور سالمیت کی قدروں کی حفاظت کی گئی ہے۔ لیکن حسبِ ضرورت یہ اخلاقی ذمہ داریاں قانونی شکل اختیار کر سکتی ہیں اور اس کے لیے فقہ اسلامی میں گنجائش موجود ہے۔ اگر ملکی معیشت تنگ حالی سے دوچار ہو۔ اصحابِ دولت عیش پرستی میں ڈوب کر اپنے اخلاقی فرائض سے غافل ہو گئے ہوں۔ سب کے لیے کام کے مساوی مواقع موجود ہونے کے باوصف زکات و صدقات اور رضا کارانہ امداد سے حاجت مندوں اور معذوروں کی ضرورتیں تشنۂ تسکین رہ جائیں، اشیائے ضرورت کی قلت کے بغیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گراں بازاری پریشان کن حد تک پہنچ جائے تو اجتماعی مفادات و مصالح کے تحفظ کے لیے بشرطِ ضرورت اسلامی ریاست قانونی پابندیاں یا نئے محصولات عائد کر سکتی ہے تاکہ فرد کو فطری ارتقا کا موقع ملے اور اجتماع کو فلاح میسر ہو۔

مارکسی اشتراکیت کا نظریہ کہ قدرِ زائد صرف محنت کی پیداوار ہے، محض ایک بے دلیل مفروضہ ہے۔ قدرِ زائد کی پیدائش میں سرمایہ، محنت، قدرتی وسائل اور کاروباری جد و جہد تمام عوامل کا حصہ ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ قدرِ زائد کی تقسیم میں یہ سارے شریک نہ ہوں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ محنت کش چونکہ کمزور طبقہ ہے، اہلِ سرمایہ اس کے استحصال سے باز ہیں اور اسے مناسب حصہ آمدنی کا ملے لیکن اس استحصال کو روکنے کے لیے تمام ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لینا لازمی نہیں۔ ایک ملی جلی معیشت میں اقتصادی منصوبہ بندی بھی اچھے نتائج پیدا کر سکتی ہے جیسا کہ سرمایہ دار ملکوں میں تجربات سے ثابت ہوا ہے۔ فلاحی منصوبہ بندی خالص سرمایہ داری نظام کے طفیل کسی ملک میں بھی رائج نہیں ہے۔ اقتصادی منصوبہ بندی کے ذریعے پیداوار کے ہدف مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ وسائل سرمایہ کاری کی اہمیتوں کے اعتبار سے مختلف صنعتوں کی تقسیم کی جا سکتی ہے۔ ان کے طریق کار کی ضابطہ بندی ہو سکتی ہے۔ تقسیم دولت کے بنیادی اصول طے کیے جا سکتے ہیں تاکہ سرمایہ و محنت کی آویزش کے امکانات کم سے کم رہ جائیں۔ اجرتوں، کرایوں، منافعوں اور عام اشیا کی قیمتوں کو چند اصولی حدود کا پابند بنایا جا سکتا ہے۔ محاصل کا ایک موزوں نظام مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سماجی عدل کے تمام تقاضے پورے کیے جا سکتے ہیں اور استحصال کی راہوں کو مسدود کیا جا سکتا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ دعویٰ بے جا نہیں کہ اگر اسلامی معاشرہ کا قیام نیک نیتی سے عمل میں لایا جائے تو یہ ہمیں سب اجنبی سماجی فلسفوں سے بے نیاز کر سکتا ہے۔ اسلام کا معاشرتی نظام جامع اور مانع ہے اور حجازی لے کا رسیا کسی مغربی مزامیر کی جھنکار کا محتاج نہیں۔ لیکن اسلامی نظام کا قیام تبھی ممکن ہے، جب ہر فرد ملت کے دل میں اس کے لیے لگن موجود ہو۔ اور معاملہ اقرار باللسان سے تصدیق بالقلب تک پہنچ جائے۔ ایمان، اتحاد اور تنظیم کے اصولوں کو پسِ پشت ڈال کر ہم نے زندگی کی تلخیوں کا عبرت آموز تجربہ کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی اقدار کو اگر ہم دل کی گہرائیوں میں سمولیں اور یہ سمجھ لیں کہ ہم سب سے پہلے پاکستانی اور اس کے بعد بنگالی، پنجابی، سندھی، پٹھان یا بلوچ ہیں، انشاء اللہ ہماری تمام مشکلات آسان ہوجائیں گی اور اجتماعی فلاح و بہبود کی منزل "فتح قریب" کی صورت اختیار کرے گی اور معاملہ زبانی اقرار سے بڑھ کر دلی تصدیق تک پہنچ جائے گا۔

(شام ہمدرد کی تقریب منعقدہ ۰، اگست ۱۹۶۹ میں لاہور میں پڑھا گیا)

مجمع البحرین

مصنفہ مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

مصنف کے نام جناب ممتاز حسن صاحب کا مکتوب گرامی۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء

مکرمی و محترمی۔ "مجمع البحرین" میں نے دیکھی۔ جیسا آپ کو معلوم ہے، میرے دل میں یہ ایک دیرینہ خواہش تھی کہ شیعہ سنّی کی متفقہ روایات کو یکجا کیا جائے تاکہ ان دو بڑی جماعتوں میں مفاہمت کا راستہ ہموار کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کام آپ کے مبارک ہاتھوں سے پورا ہوا۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات نے ہمیں آج یہ دن دکھایا ہے کہ ہم ہر حیثیت سے ذلیل و خوار ہیں۔ اگر ہمیں زندہ رہنا ہے اور دوسری قوموں اور امتوں کے درمیان کوئی باعزت مقام حاصل کرنا ہے تو ہمیں لازم ہے کہ ہم آپس میں اتفاق اور یک جہتی پیدا کریں۔ اس سلسلہ میں "مجمع البحرین" ایک نہایت گراں قدر کوشش ہے۔ آج سے دو سو سال پہلے نادر شاہ نے شیعہ سنی اتحاد کی سلسلہ جنبانی کی تھی۔ افسوس ہے کہ وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے، اگر کسی نے اس کوشش کو آگے بڑھایا ہے تو وہ آپ ہیں خدا آپ کو جزائے خیر دے اور اس کام کی تکمیل کا موقع عطا کرے۔ میں اس دن کا منتظر ہوں جب ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن پر ایمان رکھنے والے مسلمان اپنے اختلافات کو بھلا دیں گے اور بالاتفاق اپنے آپ کو ایک ہی مقصد کے لیے وقف کر دیں گے اور "انتم الاعلون" کا مقام جو ان کے لیے مخصوص ہے، اسے حاصل کر کے رہیں گے۔ امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوگا۔

مخلص: ممتاز حسن (کراچی)، سابق مینجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان۔

© rasailojaraid.com